برطانوی سامراج سے پہلے برصغیر میں علوم دینیہ کی تدریس کا اہتمام
(ایک تحقیقی مطالعہ)

The Arrangement of Religious Education in Subcontinent before British Imperialism (A Research Review)

*ریحانہ کنول

**ارشاد اللہ

ABSTRACT

In the subcontinent, before British imperialism, Muslims received their religious education from mosques, while primary schools were attached to it. These institutions instilled in students a sense of awareness and a broad worldview and produced scholars who served simultaneously in government offices and at the social level. The main purpose of this education was to prepare the people for the world and the hereafter at the same time.

This article defines "Education" and its importance in Islam. It discusses the system of Muslim religious education particularly focusing on its objectives and curriculum and the role of the Mosque in it during the Muslims' Empire in the Subcontinent. The trends of Muslim Education during the reigns of Muhammad Bin Qasim, Mahmud Ghaznavi, Ghurid dynasty, Khilji dynasty, Mamluk Dynasty, Tughluq dynasty, Lodi dynasty, and Mughal Empire are discussed in detail with all the famous Masajid (mosques), schools, centers of learning, pieces of writing and scholars of those eras. With the coming of the Mughals, educational and cultural activities received a great fillip. During the reign of the Mughals, subjects like philosophy, history, literature, and arts made tremendous progress.

Through this article, a brief overview of the Muslim education system in the subcontinent will be highlighted among modern scholars.

KEYWORDS:

Muslims' Education in Subcontinent, Mosque, *Religion Islam, Curriculum.*

---

*ایم فل اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس، لاہور

** پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ و عربیہ، گومل یونیورسٹی، ڈیرہ اسماعیل خان

تعلیم کا معنی و مفہوم:

اپنی اصل کے اعتبار سے تعلیم لفظ "علم" سے ماخوذ ہے۔ علم کے معنی کسی چیز کو جاننا یا حقیقت کی گہرائی کا ادراک کرنا کے ہیں۔ انگریزی زبان میں تعلیم کا متبادل لفظ ایجوکیشن (Education) ہے جو کہ لاطینی زبان کے لفظ "educere" سے ماخوذ ہے جس کا مطلب رہنمائی کرنا ہے۔[1] امام غزالیؒ کے نزدیک "تعلیم وہ عمل ہے جس کے ذریعے فرد کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر سکے اور نیکی و بدی میں تمیز کر سکے۔" ابن خلدون کے نزدیک "تعلیم کا مقصد حقیقت کا علم حاصل کرنا ہے جو پیغمبروں کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔"[2]

تعلیم کی اہمیت:

اسلام میں تعلیم کی جو اہمیت ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آنحضور ﷺ پر سب سے پہلے جو وحی الٰہی نازل ہوئی، اس کا آغاز لفظ "اقراء" سے ہوا تھا جس کا معنی ہے "پڑھ"۔

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ اِقۡرَاۡ وَ رَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۙ الَّذِىۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ يَعۡلَمۡ ؕ[3]

"اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے سب کو پیدا کیا۔ انسان کو خون بستہ سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب سب سے بڑھ کر کرم والا ہے۔ جس نے قلم سے سکھایا۔ انسان کو سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔"

یوں اسلام میں تعلیم کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ بنیادی طور پر مذہب اسلام تعلیم و تربیت کا ایک نظام ہے جس کی عمارت کی پہلی اینٹ "اقرأ" ہے۔ خدا نے جب آدمؑ کو پیدا کیا تو سب سے پہلے اسے اسمائے اشیاء کا علم دیا گیا۔ قرآن مجید کہتا ہے:

قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِى الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ[4]

"جو لوگ نہیں جانتے کیا وہ ان لوگوں کے برابر ہو سکتے ہیں جو جانتے ہیں؟"

آنحضور ﷺ نے فرمایا:

"طلب العلم فريضة على كل مسلم"[5]

"علم کی طلب ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے۔"

گویا یہ اسلام ہی ہے جس نے عام تعلیم اور ہر شخص کے لیے علم کا تصور پیش کیا۔ ایک طرف اسلام نے تعلیم کو بنیادی ضرورت قرار دیا تو دوسری طرف اس کو حاصل کرنے کی ذمہ داری فرد اور معاشرے دونوں پر عائد کی ہے۔

اسلام کا یہ اصول ہے کہ جو چیز سب پر فرض ہو، اس کی فراہمی کی اوّلین ذمہ داری فرد پر جبکہ آخری ذمہ داری معاشرے اور ریاست پر عائد کرتا ہے۔[6]

اسلامی نظام تعلیم:

تعلیم کے عناصر کا ایسا مجموعہ جو باہم مربوط ہو کر اسلامی مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں ہوں اور ہم آہنگ ہو کر ایک وحدت کی حیثیت اختیار کر لیں تو یہ عناصر کا مجموعہ اسلامی نظام تعلیم کہلائے گا۔[7] اسلامی نظام تعلیم سے انسان کی اخروی اور دنیوی فوز و فلاح حاصل ہوتی ہے۔ اخروی فلاح و بہبود سے انسان جہنم کے عذاب سے بچ جاتا ہے اور جنت کی نعمتوں کو پالیتا ہے۔ دنیاوی فلاح و بہبود حاصل ہونے سے انسان امن و سکون کی زندگی گزارتا ہے۔

برطانوی سامراج سے پہلے برصغیر میں علوم دینیہ کی تدریس

مقاصد تعلیم:

برصغیر میں مسلم دور حکومت میں تعلیم کا مقصد طلباء میں مذہبی جذبہ پیدا کرنا، ان کی صلاحیتوں کو سامنے لانا، ان کی ذہنی قوتوں کی تربیت کرنا اور انہیں وہ سب کچھ مہیا کرنا جو ان کی اخلاقی اور مادی بہتری کے لیے ضروری تھا۔ دوسرے لفظوں میں تعلیم کا مقصد کردار کی تشکیل تھا۔ تعلیم کو اس زندگی اور موت کے بعد زندگی کے لیے تیاری کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ مذہب تعلیم کی جڑ تھا۔ ہر مکتب اور مدرسہ کے ساتھ ایک مسجد منسلک تھی اور ہر مسجد میں طلبا کو مذہب کے علاوہ دوسرے علوم کی بھی تعلیم دی جاتی تھی تاکہ مذہبی اور غیر مذہبی تعلیم ساتھ ساتھ جاری رہے۔ اس نظام تعلیم کا مقصد ایسے لوگ پیدا کرنا نہیں تھا جو صرف اس دنیا میں کامیابی چاہتے ہوں بلکہ حقیقی علماء پیدا کرنا تھا جو سچائی کی تعلیم کے لیے خود کو وقف کر دیتے تھے۔

نصاب تعلیم:

مسلم دور حکومت میں تعلیم کے نصاب میں یہ مضامین شامل تھے: ابتدائی مرحلے میں نصاب پڑھنے لکھنے اور ابتدائی حساب پر مشتمل تھا۔ ثانوی اور اعلیٰ مراحل میں اس میں درج ذیل علم کی شاخیں شامل ہوتی تھیں: اخلاقیات، مذہب (دینیات)، علم فلکیات، انتظامی فن، حساب، الجبراء، قانون، زراعت، معاشیات اور تاریخ۔ ہندوؤں کے لیے ان کی قومی کتابیں تجویز کی جاتی تھیں۔[8] اگرچہ یہ نصاب ہندوستان کی تمام مسلم یونیورسٹیوں میں نہیں پڑھایا جاتا تھا لیکن ان میں سے زیادہ تر مضامین طلباء کو پڑھائے جاتے تھے۔ وہ مضامین کے انتخاب میں اپنی رائے کا استعمال کر سکتے تھے۔ اس معاملے میں ان پر کوئی زبردستی نہیں تھی۔ وہ اپنی زندگی کے مقاصد کے مطابق تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ جس وقت پنجاب میں غزنیوں کا تسلط قائم ہوا تھا، اس وقت تمام اسلامی علوم مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف اچھی طرح نشوونما پا چکے تھے۔ مسلم دربار کی زبان فارسی ذریعہ تعلیم تھی اور قرآن کی زبان عربی کا سیکھنا مسلمانوں کے لیے ضروری تھا۔

مسلمانوں کے دینی نظام تعلیم میں یہ مضامین شامل تھے: نحو (مصباح، کافیہ، لباب الالباب)، فقہ (مجمع البحری، قدوری، الہدایہ)، اصول فقہ (حسامی، المنار، اصول بزدوی)، تفسیر (مدارک، بیضاوی، کشاف)، تصوف (عوارف المعارف، الفصوص، نقد الفصوص)، حدیث (مشارق الانوار، مصابیح السنہ)، ادب (مقامات حریری)، منطق (شرح شمسیہ) اور علم الکلام (شرح الصحائف، عقیدہ نسفیہ، قصیدہ لامیہ)۔

مصوری اور موسیقی جیسے فنون لطیفہ سیکھنے کے لیے طلباء اپنے منتخب کردہ اساتذہ کے گھروں میں جایا کرتے تھے۔ ان کے قدموں میں بیٹھ کر یہ فنون سیکھا کرتے تھے۔ ہزاروں کارخانے بھی موجود تھے جہاں کاریگروں کے شاگرد بن کر وہ ان فنون اور صنعتوں کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور کسی خاص فن میں مہارت حاصل کرتے تھے۔[9]

برصغیر میں مسلم حکمرانوں کی علمی سرپرستی:

زمانہ وسطیٰ میں کوئی بھی حکومت خواہ کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ تھی، اس میں عوام کی باقاعدہ تعلیم کا محکمہ نہ تھا۔ جبکہ برصغیر میں مسلم دور حکومت میں ایک محکمہ موجود تھا جو کہ مذہبی اور تعلیمی اداروں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ برصغیر میں ایسا کوئی بھی مسلمان شہزادہ نہ تھا جس کا نام کسی طرح کسی سکول یا کالج کے کھولنے کے ساتھ نہ جڑا ہو۔ ان مسلمان حکمرانوں نے اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں سکول و کالجز کھولے اور لائبریریاں بنائیں۔ ایک ہندو تاریخ دان کے مطابق ایک ایسا بھی وقت تھا کہ جب ہندوستان کی مسلم یونیورسٹیوں میں ہزاروں طلباء کا ہجوم تھا اور ایک ایک پروفیسر کے کئی کئی سو سامعین ہوتے تھے۔[10] مسلم حکمرانوں کی اس علم سرپرستی کا نتیجہ تھا کہ وہاں ادباء، شعرا اور علماء کی بہتات تھی۔ ذہین لیکن غریب طلباء کی مفت تعلیم کے لیے انتظامات کیے جاتے تھے۔ انہیں وظائف دیئے جاتے اور ان کی مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑی جاتی تھی۔ اکثر اوقات ریاست سکول اور یتیم خانے تعمیر کرتی تھی جہاں غریب اور یتیم بچے مفت تعلیم حاصل کرتے تھے اور اکثر ان یتیم اور غریب بچوں کو شہزادے اپنے خرچے پر تعلیم دلواتے تھے۔ تعلیم کے معاملے میں امیر اور غریب بچوں کے درمیان کوئی فرق نہ کیا جاتا تھا اور یہ بات ان کے زمانے کے لوگوں کو متحد کرنے کا سبب بنی۔[11] ریاستی سکولوں اور مدرسوں میں تنخواہ دار استاد اور پروفیسر رکھے جاتے تھے۔ ذاتی طور پر گھروں میں جو سکول بنائے جاتے تھے، ان میں استاد بغیر کچھ وصول کیے اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے۔ پرنٹنگ پریس نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم کی ترقی میں کسی حد تک رکاوٹ تھی کیونکہ کتب ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ کئی لائبریریوں میں ہاتھ سے لکھے ہوئے خوش خط مخطوطات موجود تھے۔ خوش خطی کو بہت اہمیت دی جاتی تھی اور یہ ایک پڑھے لکھے آدمی کی کامیابی کا حصہ سمجھی جاتی تھی۔[12]

آج کے دور کے برعکس امتحانات، تعلیم کا واحد مقصد نہیں تھے۔ لوگ بھی ڈگری اور ڈپلومے حاصل کرنے کے لیے پاگل نہیں تھے۔ بلکہ علم کے حصول کا مقصد اپنے کردار اور ذات کی بہتری تھا۔ اس دور میں کوئی بھی امتحان پاس

کرنے کے لیے وقت کی کوئی حد نہیں تھی کہ جس میں وہ امتحان پاس کرنا ضروری ہو۔ طلباء کی قابلیت کو جانچنے کے لیے صرف ایک امتحان ہوتا تھا۔ کوئی ماہانہ اور سالانہ امتحان نہ تھے۔ جماعت کا انچارج استاد ہی اپنی جماعت کے طلباء سے امتحان لیتا اور کامیاب طلباء کو اگلی جماعت میں بھیج دیا جاتا۔ سند کے علاوہ وظیفے، انعامات اور تمغات بھی دیئے جاتے تھے۔ الغرض اس دور کا امتحانی نظام سادہ لیکن کہیں زیادہ کامیاب تھا۔[13]

سلاطین دہلی کے زمانہ میں مسجد کو مرکز تعلیم کی حیثیت حاصل تھی۔ اس دور میں مسلمانوں کی آبادی کے ہر محلہ اور ہر بستی میں ایک مسجد ضرور ہوتی تھی اور ہر بڑی آبادی میں ایک بڑی مسجد (جامع مسجد) ہوتی تھی۔ یہ مساجد مراکز تعلیم کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ہر مسجد میں ایک مدرسہ ضرور ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے مشہور مدرسے اور یونیورسٹیاں مسجدوں میں ہی قائم ہوئیں۔ ابتداء میں مسجد سے الگ مدرسے کا رواج نہ تھا لیکن طلبہ اور شائقین علم کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر آہستہ آہستہ مسجد سے ملحق مدرسوں کی عمارتیں بھی تعمیر کی گئیں۔ ان مساجد اور ان سے ملحق مدارس میں ناظرہ قرآن مجید کی تدریس اور حدیث و فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ عربی، فارسی، ریاضی اور خوش نویسی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہاں تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ مکتب اور مدرسے میں مسلمان بچوں کو سب سے پہلے قرآن مجید (ناظرہ) کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بعد ازاں مروجہ زبان (فارسی) پڑھنے لکھنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ساتھ ہی دینی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ استاد مختلف تدریسی طریقوں سے کام لے کر طلبہ کے علم میں اضافہ کرتا تھا۔ بہت سے لوگ اپنے قرب وجوار کے بچوں کو اپنے طور پر خود تعلیم دیتے تھے۔ حصول سعادت کے لیے قرآن مجید (ناظرہ و حفظ) کی تعلیم بچوں کو دیتے تھے۔ اس کی تکمیل کے بعد پڑھنے لکھنے، اور حساب کی تعلیم دیتے تھے۔ یہ خدمت بلا معاوضہ محض رضائے الٰہی کے لیے ہوتی تھی۔ بارھویں صدی عیسوی میں ایک مسافر نے دمشق میں بچوں کو تختی پر قرآن کی آیات کی بجائے عربی اشعار لکھنے کی مشق کرتے دیکھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ قرآن کے مقدس الفاظ لکھ کر مٹائے نہ جائیں۔[14] ابتدائی مدارس کی طرح ثانوی مدارس بھی مسجدوں میں قائم تھے۔ یہ نظام تعلیم اپنے ساتھ نصاب تعلیم بھی لایا جس میں مقامی ضروریات کے مطابق تھوڑی بہت تبدیلی کر لی گئی۔ اس دور کے نصاب تعلیم کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ۔ ابتدائی مدارس کا نصاب صرف قرآن پڑھنے اور لکھنے پر مشتمل نہیں تھا بلکہ اس میں دیگر مضامین بھی شامل تھے۔ قواعد، کتابت اور حساب کی بھی تعلیم دی جاتی تھی اور نبی اکرم ﷺ کے حالات زندگی بھی پڑھائے جاتے تھے۔ بچوں کی تعلیم میں عربی ادب اور شاعری پر بھی توجہ دی جاتی تھی۔ اساتذہ، بالخصوص اعلیٰ جماعتوں کے اساتذہ کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔[15] ابتدائی مدارس کی طرح ثانوی مدارس بھی مسجدوں میں قائم ہوئے۔ ان مدارس کا نصاب قرآن اور حدیث کے مطالعے پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ ان میں عربی زبان، ادب اور قواعد کی تعلیم

دی جاتی تھی اور تفسیر اور فقہ پڑھائے جاتے تھے۔ بعد میں نجی ثانوی مدارس وجود میں آئے اور اساتذہ اپنے گھروں میں ان علوم کی بھی تعلیم دیتے تھے جو مسجد میں نہیں پڑھائے جاتے تھے۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا فاتحانہ داخلہ پہلی صدی ہجری یعنی آٹھویں صدی عیسوی 93ھ / 712ء میں ہوا۔ محمد بن قاسم ابن عقیل ثقفی نے 10 رمضان المبارک 93ھ کو سندھ کو فتح کیا۔[16] اگرچہ یہاں پر محمد بن قاسم صرف تین سال گورنر رہا لیکن ان تین سالوں میں اس نے جہلم کی پہاڑیوں سے لے کر سندھ تک کا سارا علاقہ اموی سلطنت میں شامل کر لیا اور اس میں اسلامی تہذیب و ثقافت کو فروغ دیا۔ اس نے سندھ کے دارالسلطنت دیبل کو فتح کیا تو وہاں ایک فوجی چھاؤنی بنا کر اس میں چار ہزار مسلمانوں کو آباد کیا۔ پھر وہاں ایک جامع مسجد بنوائی۔ اس کے بعد ملتان اور دوسرے کئی مفتوحہ شہروں میں جامع مسجدیں بنوائیں۔ ان مساجد کے ساتھ اسلامی روایت کے مطابق مدرسے بھی بنوائے برصغیر پاک و ہند میں عام مسلمانوں نے بھی دینی تعلیم کا نظام قائم کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس کے لیے مساجد و مدرسے بنائے۔ دینی تعلیم کے لیے کی جانے والی کوششوں کے بارے میں پروفیسر امیر الہدیٰ لکھتے ہیں:

> "برصغیر کے مسلمانوں نے یہاں کی تمام قوموں سے بڑھ چڑھ کر علوم کی اشاعت و ترقی میں حصہ لیا۔ مسلمانوں میں یہ عام رواج تھا کہ وہ مسجد کے ساتھ ساتھ ایک مدرسہ بھی تعمیر کراتے تھے جہاں دینی علوم کے ساتھ دنیوی علوم کا بھی درس دیا جاتا تھا۔"[17]

بعد میں آنے والے فاتحین محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری نے برصغیر میں مسلم سلطنت کے قیام کے لیے راستہ صاف کیا۔ اگرچہ محمود غزنوی کو طوفانی مہمات کے دوران زیادہ وقت نہیں ملا لیکن اس نے غزنی کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی عمارتوں کے ساتھ سجایا اور انڈیا کے کچھ حصوں میں بھی خاص طور پر لاہور میں علم کے مراکز قائم کیے۔ سلطان محمود غزنوی کو علوم و فنون میں بہت دلچسپی تھی۔ وہ فارسی کے علاوہ عربی کا بھی عالم تھا۔ اس نے فقہ پر ایک کتاب "الفرید فی الفروع" کے نام سے لکھی۔[18] 409ھ کے بعد جب سلطان محمود غزنوی قنوج کو فتح کر کے غزنی لوٹا تو اس نے وہاں ایک جامع مسجد "عروس فلک" تعمیر کروائی۔ سعید احمد رفیق نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

> "محمود کے علمی ذوق، علمی کارناموں، مساجد، مدارس اور کتب خانوں کی تعمیر کا اثر آئندہ مسلمان حکمرانوں پر کافی پڑا۔"[19]

غزنوی دور میں عربی اور فارسی زبانوں میں علوم کی تدریس ہوتی تھی، عربی اور فارسی کے علماء نے سنسکرت اور یونانی ادب کی قیمتی معلومات سے استفادہ کیا اور اپنی تحریروں کے ذریعے انہیں منظر عام پر لائے۔ ہندوستان میں ہندوستانی کتابوں کے ترجمے فارسی اور عربی زبانوں میں کیے گئے۔[20] اس دور کے طلبہ کو یونانی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی

تھی، بالخصوص ان یونانی علوم کی جن کے ترجمے بیت الحکمت میں ہوئے جس کی بنیاد خلیفہ المامون نے 830ء میں رکھی تھی۔[21]

برصغیر کو غزنی، دمشق اور بغداد سے صرف مسجد میں مدرسے قائم کرنے کی روایت ہی ورثے میں نہیں ملی بلکہ یہ مدرسے ایک پورا نظام تعلیم اپنے ساتھ لائے جو ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے تین درجوں پر مشتمل تھا۔ طریقہ تعلیم دو طرح کا تھا۔ رسمی تعلیم اور غیر رسمی تعلیم۔ ابتدائی تعلیم کا مرکز مسجد تھی۔ چھ یا سات سال کی عمر میں بچہ مسجد سے ملحق مدرسے میں داخل ہوتا تھا جہاں قرآن بنیادی درسی کتاب کا کام دیتا تھا۔ شاگرد کا زیادہ تر کام یہ تھا کہ وہ صحیح قرآن پڑھنا سیکھے اور اسے زبانی یاد کرے۔ نصاب میں شروع سے آخر تک اصل زور حفظ پر تھا۔ اکثر جگہوں پر تین سال کی مدت میں پورا قرآن حفظ کرنا پڑتا تھا۔ حروف علت یا تلفظ کی غلطی گناہ تصور کی جاتی تھی۔ اس لیے پوری صحت کے ساتھ قرآن پڑھنا اور حفظ کرنا تعلیم کا اصل مقصد تھا۔

شہاب الدین غوری علماء کا بہت قدر دان تھا۔ اس نے غزنوی عہد کی علمی روایت کو آگے بڑھایا۔ ملتان میں غوری حکومت سے پہلے بھی اعلیٰ تعلیمی مدارس موجود تھے جن میں بڑی تعداد میں طالب علم درس و تدریس سے منسلک تھے۔ امیر خورد "سیر الاولیاء" میں لکھتے ہیں:

"درین ایام ملتان قبتہ الاسلام عالم بود، فحول علماء آنجا بودند"

"ان دنوں ملتان اسلام کا گڑھ تھا اور یہاں ممتاز علماء موجود تھے۔"[22]

اس زمانے میں برصغیر کے فاتحین کی زبان فارسی تھی۔ نظام تعلیم کچھ اس قسم کا تھا۔ قرآن کی تعلیم کے علاوہ ابتدائی جماعتوں میں لکھنا پڑھنا، حساب کتاب اور خوش نویسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

شہاب الدین غوری کی وفات کے بعد اس کے غلام قطب الدین ایبک، تاج الدین یلدوز اور ناصر الدین قباچہ اس کے جانشین بنے۔ قطب الدین ایبک کو لاہور اور دہلی کی سلطنت ملی، تاج الدین یلدوز کو غزنی اور ناصر الدین قباچہ کو سندھ کی حکومت ملی۔[23] قطب الدین ایبک نے شہاب الدین غوری کی وفات کے بعد 1206ء میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ سلطان شہاب الدین اور اس کے غلام جنرل قطب الدین ایبک کی برصغیر میں قائم کی ہوئی مسلم سلطنت سات سو سال تک جاری رہی۔ پہلا دور اگرچہ مسلسل جنگوں، بغاوتوں اور تبدیلیوں کا دور تھا لیکن یہ علم کی ترقی اور اسلام کی اشاعت کے لحاظ سے ایک شاندار دور تھا۔ برصغیر میں تعلیم کا جو نظام متعارف کروایا گیا، اس کی بنیاد آنحضور ﷺ کے وقت کا نظام تعلیم تھا۔ اس کا مرکز ایمان کے بنیادی عقائد تھے اور اس کی روح قرآن و سنت تھی۔ وہ علماء جو باقاعدہ تدریس کے پیشے سے منسلک نہ تھے، وہ بھی اسے اپنے مذہبی فریضہ کا حصہ سمجھتے تھے کہ دوسروں کو تعلیم دیں۔ مسجد سب سے بڑا مرکز تعلیم تھی جہاں طلباء گروہوں کی صورت میں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ لیکن اس کا مطلب

یہ نہیں کہ تعلیم صرف مذہب پر مرکوز تھی۔ مذہب کے علاوہ بہت سے فنی اسکول بھی تھے جن میں فنون، دستکاریاں اور حساب کتاب وغیرہ جیسے دوسرے علوم سکھائے جاتے تھے۔[24]

قطب الدین ایبک کے زمانے میں لاہور کے 90 فی صد عوام تعلیم یافتہ تھے اور لاہور اہل تقویٰ اور ممتاز علماء و طلباء کا مرکز تھا۔ جیسا کہ حسن نظامی لکھتے ہیں: اس میں شریعت کی بنیاد محکم ہے اور میں ضلالت و گمراہی کی بنیاد ویران ہے۔ اس کے سو میں سے نوّے لوگ عالم ہیں اور اٹھارہ میں سے نو مفسر قرآن ہیں۔[25] مسلمانوں کی دینی تعلیم عموماً عربی اور فارسی زبان میں دی جاتی تھی جبکہ ہندوؤں کی تعلیم سنسکرت زبان میں دی جاتی تھی۔ ایبک کی وفات کے بعد ناصر الدین قباچہ نے سندھ میں اپنی حکومت قائم کی۔ اوچ شہر کو اپنی حکومت کا مرکز بنایا۔ قباچہ علم دوست تھا۔ علماء کی قدر کرتا تھا۔ اس کے دور میں علماء اس کی سلطنت کے مختلف شہروں میں درس و تدریس کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ اس نے خراسان، غور اور غزنین کے علماء کو بڑے بڑے انعام و کرام دیئے۔ ناصر الدین قباچہ کے عہد میں اوچ شہر میں علم و فضل کے اعتبار سے بہت ترقی ہوئی۔ ناصر الدین قباچہ کو "حضرت اوچ" بھی کہا جاتا ہے۔ اسی عہد میں اوچ میں مدرسہ فیروزیہ کی تعلیمی سرگرمیاں بہت عروج پر رہیں۔ اوچ شہر میں شاہی دارالعلوم کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے مدرسے قائم کیے گئے تھے۔ ناصر الدین قباچہ نے منہاج سراج کو مدرسہ فیروزیہ کا انچارج مقرر کیا۔ اوچ میں مدرسہ گاذرونیہ، مدرسہ بہائیہ، مدرسہ خانقاہ جلالیہ اور درسگاہ گیلانیہ وغیرہ بھی موجود تھیں۔ یہ تمام درسگاہیں نہ صرف مسلمانوں کی دینی تعلیم کا مرکز بنیں بلکہ ان درسگاہوں کے ذریعے اسلام کی اشاعت بھی ہوئی۔ قباچہ کا عہد تعلیمی لحاظ سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ منہاج سراج جیسے نامور مورخ اور قاضی کے علاوہ قطب الدین کاشانی، علی بن حامد بن ابی بکر کوفی، نور الدین محمد بن عوفی الحنفی البخاری اور شیخ محمود فاروقی جیسے اصحاب علم و فضل کا اجتماع اس دور میں اوچ کی تعلیمی ترقی کا واضح ثبوت ہے۔ محمد عوفی نے اپنی کتاب میں شمس الدین بلخی کو اعلیٰ درجہ کا شاعر اور خطاط بتایا ہے اور ان کو "تاج الفضلاء" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔[26] ناصر الدین قباچہ کی علم پروری کی وجہ سے مولانا قطب الدین کاشانی ماوراالنہر سے ہندوستان تشریف لائے تھے اور ملتان میں قیام کیا۔ ان کے علمی مرتبہ کے پیش نظر قباچہ نے ایک مدرسہ ان کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ اس مدرسے میں طلباء کا اجتماع ہوتا تھا۔ شمس الدین بھی صوفیاء کرام سے خاص شغف رکھتا تھا۔ جب کسی بزرگ یا عالم کی آمد کا سنتا تو اس کے استقبال کے لیے جاتا اور عزت و احترام سے اپنے شاہی محل میں ٹھہراتا۔ قاضی جاوید لکھتے ہیں:

> "صوفیاء کی خانقاہیں فکر و دانش اور تہذیب و ثقافت کا گہوارہ بن گئی تھیں۔ التتمش خود فقر دوست تھا۔ وہ راتوں کو جاگتا تھا اور کسی کو بیدار نہیں کرتا تھا۔ وہ نہایت عابد و زاہد، صوفی منش اور فکر پسند طبیعت کا مالک تھا۔"[27]

شمس الدین التتمش نے خاص طور پر دار السلطنت دہلی میں کئی مدارس قائم کیے۔ دہلی کا مشہور و معروف مدرسہ "مدرسۂ معزی" اسی علم پرور بادشاہ کے دور حکومت کی عظیم یادگار ہے۔ اسی طرح بدایون میں بھی شمس الدین التتمش نے اپنے دور حکومت میں ایک مسجد اور اس سے متصل معزی نامی مدرسہ قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ شمالی ہند میں مشہور علمی مرکز بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ مدارس اپنے آقا شہاب الدین غوری جن کا اصلی نام "معزالدین محمد غوری" تھا، کے نام پر قائم کیے تھے۔[28] سلطان التتمش کی بیٹی سلطانہ رضیہ بڑی ذی علم خاتون تھی۔ قرآن پاک کی تلاوت بے حد ادب اور تعظیم کے ساتھ کرتی تھی۔ مذہبی علوم پر گہری نظر رکھتی تھی اور دیگر علوم و فنون کے بارے میں بھی تعلیمی قابلیت اور معلومات رکھتی تھی۔ "تاریخ فرشتہ" میں محمد قاسم فرشتہ لکھتے ہیں:

> "سلطانہ رضیہ قرآن کی تلاوت بے حد ادب اور تعظیم کے ساتھ کرتی تھی اور مذہبی علوم کے علاوہ دوسرے علوم و فنون میں بھی اس کی نظر بڑی گہری تھی۔"[29]

خلجیوں کے دور میں سلطان علاؤ الدین کا زمانہ (695ھ / 1295ء تا 715ھ / 1315ء) ہندوستان میں علوم اسلامی کا عہد زریں سمجھا جاتا تھا۔ اس میں سرزمین پنجاب سے کئی نامور شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کے علم کا سکہ پورے ہندوستان میں چلتا تھا۔ ایسے علماء میں قاضی مغیث الدین (بیانہ)، مولانا رکن الدین سنامی، مولانا حجت ملتانی، مولانا شہاب الدین ملتانی، مولانا علاؤ الدین لاہوری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔[30] سلطان غیاث الدین خلجی نے ایک مدرسہ ظفر آباد نعلچہ میں تعمیر کرایا تھا۔ اس زمانے میں دار الملک دہلی میں ایسے علماء اور ماہرین فن موجود تھے کہ بخارا، سمرقند، بغداد، مصر، خوارزم، دمشق، تبریز، رے، روم، وغیرہ میں ان کا ثانی تلاش کرنا ممکن نہ تھا۔ علوم اسلامی کا ہر گوشہ، منقولات و معقولات کا ہر ہر پہلو، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، اصول نحو، لغت، بیان، کلام، منطق ان پر روشن تھا۔ مولانا سید عبد الحئ مرحوم نے جو نصاب متعین کیا، وہ یہ تھا: **نحو:** کافیہ، لب الالباب مصنف ناصر الدین بیضاوی۔ **فقہ:** ہدایہ۔ **اصول فقہ:** منار، اصول بزدوی۔ **تفسیر:** مدارک، بیضاوی، کشاف۔ **تصوف:** عوارف المعارف، الفصوص۔ **حدیث:** مشارق الانوار اور مصابیح السنہ۔ ادب: مقامات حریری (طلباء بالعموم زبانی یاد کرتے تھے)۔ منطق: شرح شمسیہ۔ فن کلام: شرح صحائف، تمہید ابو شکور سالمی۔[31] یہ نصاب بارہویں صدی عیسوی اور پندرہویں صدی عیسوی کے درمیان 200 سال تک رائج رہا۔ عہد خلجی میں دارالسلطنت علم و دانش کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا۔ خلجی دور میں نہ صرف تعلیم نسواں کا انتظام تھا بلکہ انہیں دیگر علوم و فنون کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ خلجیوں کے دور حکومت میں ہندوستان میں اردو زبان کی بنیاد پڑی۔ اس زبان کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ اس ملک میں ترک، افغانی، ہندوستانی اور دوسری قومیں آئیں تو اس ملک میں نئی زبان اردو وجود میں آئی۔ اس میں عربی، فارسی، ترکی اور ہندی الفاظ بھی شامل تھے۔ اس دور میں حکومت کی زبان فارسی تھی مگر اس زبان اردو کی کتابوں کی تصنیف کا دور بھی شروع ہو گیا تھا۔[32]

سلطان فیروز شاہ تغلق سلطان محمد تغلق کے بعد تینتالیس سال کی عمر میں 752ھ / 1351ء میں تخت نشین ہوا۔[33] سلطان فیروز شاہ تغلق بھی علم و فضل کا بڑا قدر دان تھا۔ اس نے علمی درسگاہیں قائم کرنے اور ان کی سرپرستی میں بڑا جوش و جذبہ دکھایا۔ فیروز شاہ کا مدرسہ مشرق کی اعلیٰ ترین درسگاہوں میں تھا۔ دور دراز سے لوگ اس کو دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ وہاں طلباء کے قیام کا نہایت عمدہ انتظام تھا۔ جید علماء درس و تدریس کا کام انجام دیتے تھے۔ اس دور میں لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں بھی بکثرت مدارس قائم کیے گئے تھے۔ اوچ اس عہد میں بھی بدستور تعلیم کا مرکز تھا۔ مولانا عبدالحئ حسنی نے ساتویں صدی ہجری سے نویں صدی تک کے نصاب کو یوں بیان کیا ہے: **نحو:** مصباح، کافیہ، لباب الالباب مصنف قاضی ناصر الدین بیضاوی۔ بعد میں اس میں الارشاد از قاضی شہاب الدین دولت آبادی اور حواشی کافیہ کا اضافہ کیا گیا۔ **فقہ:** المتفق، مجمع البحری، قدوری الہدایہ۔ **اصول فقہ:** حسامی، المنار اور اس کی شروح، اصول بزدوی۔ **تفسیر:** مدارک، بیضاوی، کشاف۔ **تصوف:** عوارف المعارف، الفصوص، نقد الفصوص، التعرف، لمعات مؤلف عراقی۔ **حدیث:** مشارق الانوار مؤلف امام صغانی لاہوری یا مصابیح السنہ مؤلف بغوی۔ **ادب:** مقامات حریری۔ **منطق:** شرح شمسیہ۔ **علم الکلام:** شرح الصحائف۔ بعض طلباء تمہید از ابو شکور سالمی، عقیدہ نسفیہ اور قصیدہ لامیہ بھی پڑھتے تھے۔[34]

فیروز شاہ تغلق علماء سے نہایت تعلق خاطر تھا۔ اس کے دور حکومت میں بہت سے علماء و فقہاء کرام موجود تھے۔ محمد اسحٰق بھٹی بیان کرتے ہیں:

> "فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ہندوستان میں شیخ اسمٰعیل بن محمد ملتانی، قاضی ابو حنیفہ بھکری سندھی، شیخ احمد بن یحییٰ منیری، شیخ امام الدین دہلوی، امیر تاتار خان دہلوی، مولانا جلال الدین رومی، شیخ اسحٰق مغربی، مولانا شمس الدین باخرزی، قاضی ضیاء الدین برنی، مولانا عالم بن علاء اندر پتی، قاضی ضیاء الدین سمنانی، قاضی جلال الدین کرمانی، شیخ جلال الدین حسین بن احمد بخاری، شیخ عبدالعزیز اردبیلی، شیخ عثمان بن داؤد ملتانی جیسے فقہاء و علماء موجود تھے۔"[35]

ہندوستان میں فیروز شاہ تغلق نے اپنے دور حکومت میں کم از کم تیس (30) درسگاہوں کا اجراء کیا۔ ان میں مشہور ترین مدرسہ فیروز شاہی (دہلی)، مدرسہ ناصر الدین قباچہ (ملتان)، مدرسہ مقبرہ سلطان علاؤ الدین خلجی، مدرسہ بختیار بنگال اور مدرسہ محمود گاواں (دکن) مشہور و معروف درسگاہیں تھیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر این۔ این۔ لاء نے فیروز شاہ تغلق کے دور میں قائم تعلیمی نظام کے بارے میں لکھا ہے:

> "فیروز شاہ نے رعایا میں جس طرح تعلیم کی ترویج کی، کسی اور سلطان نے نہیں کی۔ اس نے مختلف علاقوں میں علماء و فضلاء کو آباد کیا تاکہ وہ لوگوں میں دینی تعلیم کی اشاعت کرتے رہیں۔"[36]

"مدرسہ فیروز شاہی" دہلی کا سب سے مشہور اور اپنے عہد کا بہترین مدرسہ تھا۔ فیروز شاہ نے یہ مدرسہ فیروز آباد دہلی میں 753ھ میں قائم کیا تھا۔ اس مدرسہ میں دینی تعلیم کا انتظام قائم تھا۔ طلباء و علماء کے وظائف مقرر تھے۔ یہ مدرسہ اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے بہت عمدہ تھا۔ جیسا کہ ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں:

"یہ مدرسہ اپنی شان و شوکت، خوبی عمارت و موقع اور حسن انتظام و تعلیم کے لحاظ سے تمام مدارس ہند میں سب سے بہتر اور عمدہ ہے۔ مصارف کے لیے شاہی وظائف مقرر ہیں۔"[37]

سکندر لودھی کے عہد میں بہت سے مدرسے اور خانقاہیں قائم ہوئیں۔ لاہور میں مدرسہ کاکو شاہ چشتی، مدرسہ سید فیروز گیلانی اور خانقاہ حضرت عبدالجلیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں کے علاوہ یہاں شیخ موسیٰ آہنگر اور بایزید ہاشمی جیسی نامور بزرگ ہستیاں بھی آباد تھیں۔ اس دور کے نصاب تعلیم میں سابقہ نصاب کے ساتھ آٹھ کتابیں مزید شامل کی گئیں۔ جیسا کہ بختیار حسین صدیقی لکھتے ہیں[38]:

> "نحو: مصباح، کافیہ، لب الالباب، ارشاد، شرح جامی۔ فقہ: ہدایہ، شرح وقایہ۔ اصول فقہ: منار الانوار، اصول بزدوی، تلویح۔ تفسیر: مدارک، بیضاوی، کشاف۔ تصوف: عوارف المعارف، نصوص الحکم، نقد النصوص، لمعات۔ حدیث: مشارق الانوار، مصابیح السنۃ۔ ادب: مقامات حریری۔ منطق: شرح شمسیہ، شرح مطالع۔ کلام: شرح صحائف، تمہید ابو شکور سالمی، شرح عقائد نسفی، شرح مواقف۔ بلاغت: مطول، مختصر المعانی۔ معلوم ہوتا ہے کہ التتمش کے عہد سے لے کر سکندر لودھی کے عہد تک مدارس کا نصاب تعلیم ایک طے شدہ منصوبے کے تحت پڑھایا جاتا رہا تھا۔ اس میں منقولات کی تدریس پر زیادہ زور دیا جاتا رہا۔ سکندر لودھی کے عہد میں نصاب میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ یہ دور تعلیمی لحاظ سے بہت اچھا ثابت ہوا۔ یہ نصاب دس علوم پر مشتمل تھا جس میں مجموعی طور پر اٹھائیس کتابیں شامل تھیں۔"[39]

نصاب کی اس تبدیلی میں سکندر لودھی کی ذاتی دلچسپی اور پنجاب کے مشہور استاد عبداللہ تلنبی کی کوششوں کا بڑا عمل دخل ہے۔

مغلیہ عہد میں علوم دینیہ کی تدریس کا اہتمام:

برصغیر پاک و ہند میں لودھی خاندان کے دور حکومت کے خاتمے کے بعد مغلیہ دور حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ برصغیر میں مغلیہ دور حکومت اڑھائی سو سال پر مشتمل ہے۔ مغل وسطی ایشیائی علاقے سے برصغیر میں آئے تھے۔ برصغیر میں ان کے دور حکومت میں زندگی کے مختلف شعبوں میں کئی نئے تصورات آئے۔ انہوں نے شعر، ادب،

تعلیم، سائنس، فلسفہ، خطاطی، مصوری اور فن تعمیر میں ترقی کی۔ مغلیہ حکمرانوں نے پہلے حکمرانوں کی طرح تعلیم و تعلم میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ ان کے درباروں میں اعلیٰ پایے کے علماء موجود رہے۔ حکمرانوں نے اپنے اپنے دور حکومت میں دل کھول کر مکاتب و مدارس کے لیے روپیہ خرچ کیا۔

مراکز تعلیم:

ابتدائی تعلیم مساجد میں دی جاتی تھی۔ اس سطح کے مدارس "مکتب" کہلاتے تھے۔ مغل حکمرانوں کی علمی سرپرستی اور تعلیم سے دلچسپی کی بدولت شہروں میں بہ کثرت مدارس اور کالج قائم ہوئے۔ مدارس و مکاتب میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ اس زمانہ میں عام مسجدیں بھی مراکز تعلیم کا کام دیتی تھیں۔ دہلی، آگرہ، لاہور، جون پور، بیجا پور، احمد آباد اور گجرات وغیرہ میں جو عظیم الشان مساجد تعمیر ہوئیں، ان کے طرز تعمیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا بڑا حصہ درس و تدریس کے کام آتا تھا۔ مساجد کی طرح بزرگوں کی قائم کردہ تعلیمی خانقاہیں بھی عموماً تعلیم گاہ کا کام دیتی تھیں۔ ان کے مصارف کے لیے حکومت عطیے دیتی تھی۔ جاگیریں اور جائیدادیں وقف ہوتی تھیں جن کی آمدنی خانقاہوں کو دی جاتی تھی۔ کسی مخیر شخص کی وقف کردہ جائیداد کی آمدنی سے بھی ان خانقاہوں کا خرچ چلتا تھا۔ سرکاری مدرسوں اور کالجوں میں درس و تدریس کا کام ہوتا تھا۔ ایسے مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہندو رعایا کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی۔

پہلا مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر تھا۔ اس کے دور میں علم و ادب کمال تک پہنچا۔ بابر کا کتب خانہ مختلف نوعیت کی کتابوں پر مشتمل تھا۔ وہ سفر و حضر میں بھی بہت سی کتابیں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ 930ھ (1524ء) میں بابر کے ہاتھ افغان حاکم غازی خان کا کتب خانہ لگا جو بابر کے نزدیک سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔ غازی خان بھی بڑا علم دوست اور شاعرانہ مزاج رکھتا تھا۔ اس کے کتب خانہ میں عمدہ اور خوش خط لکھی ہوئی کتابیں موجود تھیں۔ بابر نے ان کتابوں میں سے کچھ کتابیں اپنے لیے منتخب کیں، کچھ شہزادہ ہمایوں کو پڑھنے کے لیے دیں اور کچھ کامران کو کابل بھجوادیں۔

بابر کے وزیر سید معتبر علی کی کتاب "التواریخ" سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر کے عہد میں محکمہ تعلقات عامہ / محکمہ تعمیرات عامہ (Shahrat-i-Am) کو اس کے دیگر فرائض کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی سپرد کیا گیا کہ وہ ڈاک کا کام کرے، ایک گزٹ نکالے اور مدارس اور دارالعلوم تعمیر کرائے۔ یہ محکمہ بعد کے حکمرانوں کے دور میں بھی بدستور کام کرتا رہا۔ تعلیمی عمارتوں کی تعمیر کے کام سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت تعلیمی امور پر توجہ دے رہی تھی۔

بابر خود بھی عربی، فارسی اور ترکی زبان کا سکالر تھا جیسا کہ این۔ این۔ لاء لکھتا ہے:

"He was a great scholar in Arabic, Persian and Turki, and a fastidious critic."[40]

"وہ عربی، فارسی اور ترکی زبان کا ایک عظیم عالم اور اعلیٰ نقاد تھا۔"

بابر علم و ادب سے خاص لگاؤ رکھتا تھا۔ اس کے دور میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی عظیم روایات قائم ہوئیں۔ ظہیر الدین بابر نے علم و ہنر کی ترویج کے لیے انتظام کیا۔ جابجا مدرسے کھولے۔ مسجدیں بنوائیں اور مختلف فلاحی کاموں میں دلچسپی لیتا رہا۔

بابر کی وفات کے بعد اس کا بیٹے نصیر الدین محمد ہمایوں نے 9 جمادی الاول 937ھ (29 دسمبر 1530ء) کو آگرہ میں ہندوستان کا تاج شاہی سر پر رکھا۔ ہمایوں ترکی، فارسی، علم ہیئت، ہندسہ، نجوم، شعر اور معما گوئی میں ماہر تھا۔ اس کا کتب خانہ بڑا وسیع اور مختلف عنوانات کی کتابوں پر مشتمل تھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتا تھا۔ اکثر مہمات پر بھی اپنے ساتھ مطالعہ کے لیے کتابوں کی ایک منتخب لائبریری ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ جیسا کہ ایس ایم جعفر لکھتے ہیں:

> "جس وقت وہ ہندوستان چھوڑ کر جا رہا تھا، وہ **اپنے** ساتھ اپنی پسند کی کتابیں اور اپنے وفادار لائبریرین لالہ بیگ کو بھی جو باڈ بہادر کے نام سے موسوم تھا، لے گیا تھا۔"[41]

ہمایوں نے تعلیمی ترقی کے لیے بھرپور کوشش کی۔ اس کے عہد میں ایک مدرسہ دہلی میں موجود تھا جس کا مدرس شیخ حسین تھا۔ اس کے عہد میں دریائے جمنا کے کنارے بھی تعلیمی مدارس موجود تھے جو اس کی تعلیمی دلچسپی کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ ابوالحسنات ندوی لکھتے ہیں:

> "ہمایوں کے عہد میں آگرہ میں دریائے جمنا کے کنارے شیخ زین الدین خوافی نے ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔"[42]

ہمایوں کے مقبرے کے اوپر جو چھت تھی، وہ بھی دراصل ایک مدرسہ تھا جس میں بڑے بڑے اساتذہ وقت تعلیم دیتے تھے اور مقبرہ کے پہلو میں چھوٹے چھوٹے کمرے طلباء کی اقامت کے لیے بنے ہوئے تھے۔

ہمایوں کے ترک وطن کے بعد افغان بادشاہ شیر شاہ سوری تخت نشین ہوا۔ شیر شاہ سوری نے دہلی پر چار سال تک حکومت کی تھی۔ قلیل عرصہ حکومت کرنے کے باوجود اس نے متعدد تعلیمی مدارس بنوائے جو علوم و فنون کی ترقی کے لیے کام کر رہے تھے۔ یہ مدارس شیر شاہ سوری نے اپنے عہد حکومت (1540ء تا 1545ء) سے پہلے بنوائے تھے۔ ان مدارس میں نارنول (پٹیالہ) کا عظیم الشان مدرسہ شیر شاہ سوری کے نام سے بہت مشہور ہوا۔

جلال الدین محمد اکبر باختلاف روایات 2 یا 7 ربیع الثانی 963ھ / جنوری 1556ء کو چودہ برس کی عمر میں اپنے باپ نصیر الدین ہمایوں کی وفات کے بعد تخت ہند پر بیٹھا۔[43] اکبر خود زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا لیکن مردم شناس اور جوہر قابل کا قدر دان تھا۔ اس نے فرض شناس اور لائق افراد اپنے دربار میں جمع کر لیے تھے۔ اس کا دور علم و فن کے اعتبار سے بے حد زرخیز تھا۔ بے شمار علماء و فضلاء جو مروجہ علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے، اس کے دربار میں موجود تھے اور ملک کے

مختلف علاقوں اور صوبوں میں بھی اہل علم بہت بڑی تعداد میں علمی خدمات انجام دیتے تھے۔ بڑے بڑے شہروں میں مدارس دینی قائم تھے جن میں افاضل روزگار کا غلغلۂ تدریس زوروں پر تھا۔ مثلاً دہلی، آگرہ، احمد آباد، جون پور، لاہور، ملتان، سیالکوٹ، سرہند، وغیرہ میں مشہور زمانہ حضرات علماء نے تشنگان علوم کی علمی تشنگی بجھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔

اکبر کے دور کے تعلیمی تغیرات و انقلابات کے بارے میں غلام جیلانی مخدوم اور صفدر حیات صفدر لکھتے ہیں:

"اکبر کے دور میں تعلیمی تغیرات و انقلابات پیدا ہوئے۔ سب سے بڑا تغیر ابتدائی تعلیم میں یہ ہوا کہ مدت تعلیم گھٹ گئی اور جو کام برسوں میں ہوتا تھا، مہینوں میں ہونے لگا۔ اس کے نصاب میں وسعت پیدا ہوئی اور بہت سے علوم کا اضافہ کیا گیا۔"[44]

اکبر نے اپنے دور میں بہت سی تعلیمی اصلاحات بھی نافذ کیں۔ جو علوم اس دور میں پڑھائے گئے، ان میں اخلاقیات، علم الحساب، بہی کھاتہ اور فن زراعت، وغیرہ ہیں۔ ابو الفضل ان علوم کی مکمل فہرست بیان کرتا ہے:

"اخلاقیات، علم حساب، بہی کھاتہ، فن زراعت، علم الہندسہ، علم الساحت، علم ہیئت، علم رمل، معاشیات، انتظام ملکی، طبیعات، منطق، فلسفہ و حکمت، ریاضیات، الٰہیات اور تاریخ۔"[45]

اکبر کے دور کا سب سے بڑا تعلیمی کارنامہ یہ ہے کہ اس کے دور میں رسمی تعلیم دینے کا رواج ہوا اور اس کے لیے عام اسکولوں کا رواج ہوا تھا۔ کچھ مشترکہ اسکول بھی قائم ہوئے جن میں ہندو اور مسلمان طلباء ایک ہی استاد سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اس نے مختلف طلباء کے لیے مختلف قسم کا نصاب مقرر کیا۔ ہندو طلباء کے لیے ان کے مذہب اور معاشی و معاشرتی صورتحال کو مد نظر رکھتے ہوئے نصاب مقرر کیا گیا۔

اس عہد میں تعلیم اور نصاب میں واضح تبدیلی ہوئی۔ تعلیم و تدریس کے نئے طریقے متعارف کرائے گئے۔ حروف تہجی کو ختم کر کے حروف کے جوڑ پیوند کو لکھنا اور پڑھنا سکھایا جاتا۔ اس طرح طالب علم میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی کہ وہ اشعار اور حکمت و نصیحت کی باتیں جلدی یاد کر لیتا جو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے متعلق ہوتیں۔ تدریس میں اس طریقہ کو ملحوظ رکھا گیا کہ بچہ خود حروف کو پہچانے اور ان کو ملا کر الفاظ بنائے۔ اس طریقے سے حروف کی شناخت، الفاظ کے معانی، مصرع، شعر اور آموختہ پر استاد زیادہ توجہ دیتا اور طالب علم جلدی پڑھنا، لکھنا سیکھ جاتا۔ ابو الفضل لکھتے ہیں:

"اکبری دور میں طریقہ تدریس میں اصلاح کے لیے یہ کوشش کی جاتی کہ بچہ خود حروف کا جوڑ پہچانے اور ان کو ملا کر الفاظ نکالے اور بخوبی ہجے کر سکے۔ اور ان امور میں استاد بہت کم مدد دیتا۔ چند روز میں ایک مصرع یا ایک مقولہ اس طرح پڑھایا جاتا اور یاد کرایا جاتا کہ بچہ قلیل مدت میں رواں پڑھنے لگتا۔"[46]

اس نے اپنے جانشینوں کے لیے علوم و فنون کی وسیع پیمانے پر سرپرستی کی۔ اس کے دور میں ملک میں متعدد مدرس قائم ہوئے جو علوم و فنون کی ترویج و اشاعت میں درجہ کمال کو پہنچے۔ ان مدارس کے علماء و فضلاء نے تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ بعض کتابوں کے تراجم بھی کیے۔ اس سے ادبی معیار بہت بلند ہوا۔ جیسا کہ ایس۔ ایم۔ جعفر لکھتے ہیں:

"اکبر کے دور میں ملک کے بڑے بڑے شہروں میں مدرسے قائم تھے اور دور دور سے ان مدرسوں میں اہل علم پڑھنے اور پڑھانے آتے تھے۔ جون پور، آگرہ، دہلی، احمد آباد، ملتان اور دوسرے علمی مراکز میں علوم و فنون کی ترویج درجہ کمال کو پہنچ گئی تھی۔ انہی مرکزوں کے علماء نے اپنی تصنیف و تالیف کے ساتھ ہندوؤں کی بعض کتابوں کے ترجمے کیے۔"[47]

اکبر نے فتح پور سیکری شہر کو آباد کیا اور اس میں علوم و فنون کی ترویج کے لیے کئی مدارس قائم کیے۔ اس نے فتح پوری سکری میں پہاڑی کے اوپر ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا۔ مشہور عبادت خانہ جو اصل میں مذہبی بحث و مباحثہ کے لیے وقف تھا، نامور علماء و مفکرین کی توجہ کا اہم مرکز بنا۔ عہد اکبری میں ماہم بیگم نے جو اکبر عظیم کی مرضعہ تھیں، 969ء میں پرانے قلعہ کے پاس مغربی دروازے کے مقابل ایک مسجد اور مدرسہ بنوایا۔ مدرسہ کا نام "خیر المنازل" رکھا گیا۔ پہلے مختلف علوم و فنون کے لیے مقامات مخصوص ہوتے تھے جہاں سے ان علوم کی تعلیم حاصل کی جاتی تھی۔ مثلاً صرف و نحو کی تعلیم پنجاب میں دی جاتی تھی۔ حدیث و تفسیر کی تعلیم دہلی میں دی جاتی تھی۔ منطق و حکمت کی تعلیم رام پور میں دی جاتی تھی۔ فقہ، اصول فقہ اور کلام لکھنو میں پڑھائے جاتے تھے۔ فارسی تعلیم کے علاوہ سنسکرت اور دیگر مذہبی علوم کی تعلیم کے لیے ملک کے بڑے بڑے مشہور شہروں میں بڑی بڑی درسگاہیں تھیں جہاں دور دور سے طلبہ آکر شریک درس ہوتے تھے۔

جہانگیر 14 جمادی الاول 1014ھ / 17 ستمبر 1605ء کو چھتیس برس کی عمر میں اپنے والد جلال الدین اکبر کی وفات کے بعد دارالحکومت آگرہ میں نور الدین محمد جہانگیر کے نام سے تخت نشین ہند ہوا۔[48] اس کو مطالعہ کتب کا بہت شوق تھا۔ سرکاری کتب خانے کے علاوہ اس کا ایک شاندار اور ذاتی کتب خانہ تھا۔ اس کے مہتمم کا نام مکتوب خان تھا۔ بادشاہ جہانگیر گجرات کے سفر میں بھی کتابیں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ تزک جہانگیری میں یہ واقعہ مرقوم ہے کہ جب بادشاہ گجرات گیا تو وہاں کے مشائخ کو اپنے کتب خانے سے تفسیر حسینی، تفسیر کشاف اور روضۃ الاحباب پیش کیں۔ وہ اپنے بارھویں سال جلوس کے واقعات کے حوالے سے لکھتا ہے:

"مشائخ گجرات میرے پاس آئے تو میں نے ان کے مرتبے کے مطابق انہیں خلعت، مصارف اور مدد معاش کے لیے اراضی دے کر رخصت کیا۔ ساتھ ہی ان میں سے ہر ایک کو اپنے ذاتی

کتب خانے سے تفسیر کشاف، تفسیر حسینی اور روضۃ الاحباب وغیرہ کتابیں پیش کیں اور ان کتابوں کی پشت پر اپنی گجرات میں آمد اور کتاب دینے کی تاریخ تحریر کی۔"49

وہ ترکی زبان کا عالم بھی تھا۔ یہ زبان اس نے "عبد الرحیم خانِ خاناں" سے سیکھی۔ چہل حدیث کا درس شیخ عبد النبی سے حاصل کیا۔ مغلیہ دور کا یہ بادشاہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ بہترین شاعر، ظریف طبع، فصیح البیان، ذکی و فطین اور اپنے وقت کا بہترین عالم تھا۔

جہانگیر نے اپنے دور حکومت میں ایک عالم دین شیخ محمد بن جلال حسینی گجراتی کو قرآن پاک کا فارسی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ ترجمہ لفظی ہو اور لفظ قرآن سے ایک حرف بھی زائد نہ ہو۔ ترجمہ آسان اور عام فہم ہونا چاہیے۔ الفاظ اور زبان میں کسی قسم کا تصنع اور تکلف نہ ہو۔[50] جہاں گیر سنی العقیدہ بادشاہ تھا اور اس کو علمائے وقت سے بے حد محبت و عقیدت تھی۔ جہانگیر بادشاہ علماء و صلحاء کی صحبت میں بیٹھتا تھا۔ ان سے علم کی روشنی حاصل کرتا تھا۔ ان کے فیوض برکات سے استفادہ کرتا تھا۔ ان سے حقائق و معارف کی باتیں سنتا تھا۔ جیسا کہ تزک جہانگیری میں لکھتا ہے:

"بعلماء و دانایان اسلامیہ فرمودم کہ مفردات اسمائے الٰہی را کہ دریاو گرفتن آسان باشد جمع نمائند تاں آں۔۔۔"[51]

"میں نے علمائے اسلام اور فقہاء کو حکم دیا کہ وہ مفرد اسمائے الٰہی جمع کریں کیونکہ ان کو یاد رکھنا آسان ہے۔ میں ان کا وظیفہ کرنا چاہتا ہوں۔ جمعرات کو میں علماء و صلحا اور درویشوں کی صحبت اختیار کرتا ہوں۔"

اس کے اپنے بائیس سالہ دور حکومت میں جون پور، دہلی، لاہور، آگرہ، کشمیر، سیالکوٹ، ملتان، سرہند، برہان پور، ٹھٹھہ وغیرہ میں متعدد علمائے کرام موجود تھے۔ ان علاقوں کو فقہاء و شعراء، صوفیاء و اتقیا اور علماء و صلحاء کے مراکز کی حیثیت حاصل تھی۔ جہانگیر بادشاہ ان علماء و فقہاء میں بالخصوص شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور مجدد الف ثانی کے علم و فضل کی وسعت پذیری سے متاثر تھا۔

جہانگیر مدارس دینیہ کی تعمیر کا بھی شوق رکھتا تھا۔ اس دور میں قدیم مدارس کی مرمت کی گئی اور ان میں پھر سے تعلیم و تدریس کا انتظام قائم کیا گیا۔ "جام جہاں" کا مصنف لکھتا ہے کہ جہانگیر بادشاہ نے تخت نشینی کے بعد قدیم مدارس کو جو کچھ مدت سے پرندوں اور جانوروں کا مسکن بنے ہوئے تھے، طالب علموں اور استادوں سے بھر دیا۔ ان مدارس میں طلباء جوق در جوق داخل ہونا شروع ہوئے۔ جو لوگ تعلیم کے حصول کو مذہبی فریضہ سمجھتے تھے، وہ ان مدارس میں آکر اطمینان کے ساتھ علوم و فنون کی اشاعت میں مشغول ہو گئے نیز پرانے مدرسوں کے ساتھ ساتھ نئے مدارس بھی قائم ہوئے۔ اس نے بہت سی خانقاہیں بھی تعمیر کروائیں۔ اس نے یہ قانون بھی وضع کیا کہ حدود مملکت میں جہاں بھی کوئی

مالدار رئیس یا بیرونی تاجر بغیر کسی جانشین یا وارث کے مر جائے تو اس کی تمام جائیداد و املاک بنام سلطنت منتقل ہو کر مدرسوں اور خانقاہوں پر صرف ہو۔

عید گاہ جہانگیری جو اس عہد کی ایک شاندار مسجد تھی، اس کے ساتھ بھی ایک مدرسہ ملحق تھا۔ مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی اس زمانے میں لاہور کی اس سرکاری درسگاہ میں اعلیٰ مدرس مقرر ہوئے۔ ان کا شہرۂ کمال بادشاہ جہانگیر تک پہنچا تھا۔ چنانچہ جہانگیر نے مدد معاش کے طور پر ایک معقول جاگیر مولانا کے نام مقرر کر دی تھی۔ لاہور میں جہانگیر کے عہد حکومت میں ایک مدرسہ قلیج خانی کے نام سے بہت مشہور ہوا۔ یہ مدرسہ اکبری دور میں قلیج خان اندجانی نے قائم کیا تھا اور اس مدرسہ میں تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر معقولات میں خود بھی درس دیتے تھے۔ مولانا علاء الدین جنہوں نے شرح عقائد نسفی پر حواشی لکھے ہیں، آگرہ میں درس دیا کرتے تھے۔ جو مدرسہ انہوں نے قائم کیا، وہ "مدرسہ خس" کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ یہی اس کا تاریخی نام تھا۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں:

"باگرہ آمدہ بدرس مشغول شدند د مدرسہ از خس ساختند و مدرسۂ خس تاریخیش شد۔"[52]

شیخ عبدالحق محدث دہلی جو جہانگیر کے عہد میں تھے، اخبار الخیار میں ایک مدرسہ کا ذکر کرتے ہیں جہاں انہوں نے تعلیم پائی تھی۔ اس مدرسے میں تعلیم کا وقت صبح سے دوپہر تک اور ظہر کے بعد سے شام تک مقرر تھا۔ چنانچہ شیخ موصوف روزانہ اپنے گھر سے انہیں اوقات میں مدرسہ جایا کرتے تھے۔

اقبال نامہ جہانگیر میں ہمیں کچھ علماء اور شعراء کی فہرست ملتی ہے جو بادشاہ کے ہم عصر تھے، وہ علماء یہ تھے: ملا روز بہاں شیرازی، میر شکر اللہ شیرازی، میر عبدالقاسم گیلانی،، ملا باقر کشمیری،، قاضی نصر اللہ، ملا فاضل کابلی، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی، مولانا عبدالطیف سلطان پوری، مولانا عبدالرحمان گجراتی، مولانا حسن فراغی گجراتی، مولانا حسین گجراتی، خواجہ عثمان حساری، مولانا محمد جون پور، مولانا مقصود علی وغیرہ۔[53] عہد جہانگیری میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا علمی لحاظ سے بڑا مقام و مرتبہ تھا۔ وہ قرأت و تجوید میں مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے علم حدیث کی ترویج و اشاعت کے لیے بھی کام کیا تھا۔ محدث دہلویؒ کی حدیث کے حوالے سے تعلیمی کاوشوں کے بارے میں مولوی فقیر محمد لکھتے ہیں:

> "شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہی ہیں جنہوں نے پہلے پہل حدیث کا علم عرب سے لا کر اس سے ہندوستان کو منور کیا اور اپنی تصنیفات سے علم حدیث کو ہند کے ہر ایک خطہ و قطعہ میں پھیلایا۔"[54]

علم فقہ سے متعلق شیخ محدث نے تین کتابیں تصنیف کی ہیں۔ فتح المنان فی تائید النعمان، الفوائد، ہدایت الناسک الی طریق المناسک۔ ان میں پہلی قابل ذکر کتاب عربی زبان میں ہے اور فقہ حنفی کی تائید میں ہے۔ الفوائد فقہ اور عقائد کے بارے میں ایک رسالہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری میں موجود ہے اور آخری کتاب بھی ایک رسالہ ہے

جس میں مناسک حج اور آداب زیارت حرمین کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ غرض کہ برصغیر پاک و ہند میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ عہد جہانگیری میں مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی نے لاہور میں مسند تدریس آراستہ کی اور ان کی علمی شہرت دور دراز علاقوں تک پہنچی جس سے متاثر ہو کر علماء و طلباء آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے چشمۂ علم سے سیر اب ہونے لگے۔ لالہ سبحان رائے بٹالوی ان کے فیضان علم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"طلبہ علم از ممالک دور و نزدیک در مدرسہ متبرکہ ایشاں رسیدہ فیض یاب شدند"[55]

"طلبائے علم دور و نزدیک کے ممالک سے ان (مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی) کے مدرسہ مبارکہ میں پہنچتے اور دولت علم سے فیض یاب ہوتے تھے۔"

مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی کی علمی شہرت عہد جہانگیری میں حلقہ اہل علم میں کافی پھیل گئی تھی۔ جہانگیر سمجھ دار اور معاملہ فہم بادشاہ تھا۔ توزک جہانگیری سے اس کی قوت مشاہدہ اور ذہانت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس نے اکبر کی مذہبی بدعتوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے دور میں فنون لطیفہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ جہانگیر کا عہد علمی لحاظ سے بہت درخشاں تھا۔ بادشاہ خود بھی پڑھا لکھا تھا اور مستند صاحب تالیف بھی تھا۔ تزک جہانگیری اس امر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جہانگیر بادشاہ نے تعلیم کی ترقی کے لیے بہت کاوشیں کیں۔ مدارس کی مرمت اور از سر نو تعمیرات اس بات پر شاہد ہیں کہ جہانگیر اپنے والد جلال الدین اکبر سے تعلیمی معاملات اور علوم و فنون کی ترویج میں سبقت لے گیا۔ جہانگیر کو بے نظیر انشاء پرداز تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ رائے مولانا شبلی نعمانی نے دی ہے:

"سلسلہ تیموریہ میں یوں تو ہر فرماں روا سخن فہم و اداشناس گزرا ہے لیکن اس فن میں جہانگیر اجتہاد رکھتا تھا۔"[56]

ایک روایت کے مطابق عہد جہانگیری میں وباء پھیلنے سے پہلے لاہور کے محلہ تلہ میں مرد و زن صغیر و کبیر تین ہزار حفاظ موجود تھے۔[57]

اکبر کا بیٹا شاہجہاں 1038ھ / 2 فروری 1628ء کو سینتیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس دور میں دارالحکومت آگرہ تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ شاہجہاں کی ولادت بھی لاہور میں ہوئی اور تاج شاہی بھی اسی شہر میں سر پر رکھا گیا۔ اس نے اکتیس سال برصغیر پاک و ہند میں حکمرانی کے فرائض نبھائے۔[58] اس پابند شریعت بادشاہ کے عہد میں برصغیر پاک و ہند میں اسلام کو بڑی تقویت ملی اور بدعات کا خاتمہ کیا گیا۔ سجدہ تعظیمی جو پہلے بادشاہوں کے لیے رائج تھا، اس کو موقوف کر دیا گیا۔ اس دور میں علماء و مشائخ کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا۔ شاہجہاں کے دربار میں ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، ملا محمد فاضل بدخشانی، قاضی محمد اسلم، قاضی محمد سعید، ملا میرک ہروی، ملا عبد اللطیف، میر محمد ہاشم، ملا فرید دہلوی اور میر محمد صالح نے رہ کر اس کے مذہبی خیالات کی نشو و نما میں بڑی مدد پہنچائی۔

شاہجہاں نے اپنی رعایا کی اخلاقی اور تعلیمی ترقی کے لیے بہت سے اقدامات کیے۔ اس دور میں جو تعلیمی ترقی ہوئی، اس کے متعلق این۔ این۔ لاء نے لکھا ہے:

"تمام تعلیمی ادارے جن کے لیے سابق فرماں رواؤں، امراء اور دوسرے لوگوں نے بڑی بڑی جاگیریں اور اوقاف عطا کیے تھے، وہ اس کے عہد میں بھی اسی فراغ اور خوشحالی سے چلتے رہے"[59]

شاہجہاں کے عہد حکومت میں پنجاب میں امن و خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ شاہجہاں کئی بار پنجاب کے دورے پر آیا اور لاہور سے گزر کر چار بار کشمیر اور کابل گیا۔ اس نے پنجاب کی تعلیمی ترقی پر خصوصی توجہ دی۔ اس کے دور میں تعلیم بالکل مفت تھی۔ طلباء کا طعام و قیام اور دیگر ضروریات کی ذمہ داری مدرسے پر عائد تھی۔ طلباء نہ صرف شوق سے پڑھتے بلکہ اپنا علم دوسرے لوگوں تک پہنچاتے۔ امراء کا طبقہ بھی علم و ہنر کا قدردان تھا۔ وہ حسب توفیق تعلیم پر خرچ کرتے تھے اور اسے دنیا و آخرت کی فلاح کا ضامن قرار دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں کوئی گاؤں، کوئی قریہ، کوئی محلہ اور کوئی گلی ایسی نہ تھی جہاں تعلیم و تدریس کے لیے کوئی مدرسہ اور ادارہ موجود نہ ہو۔ خاص طور پر جون پور، الہٰ آباد اور دوسرے مشرقی صوبوں میں تعلیم و تدریس کا دور دورہ تھا جس کی بناء پر شاہجہاں کہا کرتا تھا کہ "پورب شیر از ماست" شاہجہاں عہد میں کوئی بھی قصبہ تعلیمی لحاظ سے خالی نہ تھا۔ بستی، بستی، قریہ قریہ علم و ہنر کی روشنی سے منور تھے۔ عہد شاہجہانی کے معروف مؤرخ محمد صادق اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"اس وقت شاہجہانی دور میں ہر گاؤں میں ایک مدرسہ موجود تھا۔ کوئی قصبہ تعلیمی چرچے سے خالی نہ تھا۔"[60]

اس دور میں تمام مدرسے آزاد تھے اور ان میں سے اکثر مقامی اوقاف اور نیک دل لوگوں کی سخاوت پر چلتے تھے۔ عہد شاہجہانی میں تعلیمی سرگرمیاں بہت اعلیٰ و عمدہ تھیں۔ پانچ پانچ، دس دس کوس پر شرفاء کی آبادیاں تھیں جنہیں سلاطین وقت سے وظائف اور زمینیں مدد معاش کے طور پر ملی ہوئی تھیں۔ جیسا کہ مولانا آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:

"عہد شاہجہانی میں پانچ پانچ دس دس کوس پر شرفاء کی آبادیاں تھیں جنہیں سلاطین وقت سے وظائف اور زمینیں مدد معاش کے طور پر ملی ہوئیں تھیں۔ اس زمانے کے مدرسوں نے ہر جگہ طالب علموں کے لیے علم کے دروازے کھول دیئے تھے اور ان کا نعرہ تھا کہ علم طلب کرنے والو ادھر آؤ۔ علم کے طالب علم گروہ در گروہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں جاتے۔ ہر آبادی کے صاحب توفیق لوگ طالب علموں کو اپنے ہاں ٹھہراتے اور اس جماعت کی خدمت کو سعادت عظمیٰ خیال کرتے۔"[61]

شاہجہانی دور میں لاہور میں کثیر تعداد میں مدارس موجود تھے۔ ان میں سے مدرسہ مائی لاڈو، درس میاں وڈا، مدرسہ تیلی واڑہ، مدرسہ میانی صاحب، مدرسہ خیر گڑھ، مدرسہ ابو الحسن خان تربتی، مدرسہ شیخ بہلول، مدرسہ ملا فاضل قادری، مدرسہ ملا خواجہ بہاری، مدرسہ شیخ جان محمد شہروردی، مدرسہ فرید خان خاص طور پر مشہور ہیں۔ آگرہ کی جامع مسجد شاہجہاں کی بڑی لڑکی جہاں آرا بیگم کی یادگار ہے۔ بیگم نے اسی کے ساتھ ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جو بہت دنوں تک نہایت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا اور شاید کسی نہ کسی صورت میں اب تک قائم ہے۔ مسجد کے گرداگرد دکانوں کی آمدنی مسجد اور مدرسہ کے لیے وقف تھی۔ آگرہ میں مدارس کی جو کثرت تھی، اس کا پتا آج بھی محلوں کے نام قدیم عمارات اور زبانی مشہور عام روایتوں سے چل سکتا ہے۔ اس دور حکومت میں ملا عبد الحکیم سیالکوٹی نے 1052ھ / 1644ء میں سیالکوٹ میں ایک مسجد اور مدرسہ تعمیر کرایا۔ برصغیر پاک وہند میں اس مدرسے نے بہت شہرت پائی۔ اس مدرسہ میں نہ صرف سیالکوٹ کے نادار طلباء تعلیم حاصل کرتے تھے بلکہ بیرون علاقہ جات سے بھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ مستحق اور نادار طلباء کو کپڑے، کتابیں اور کھانا دارالاقامہ سے ملتا تھا۔ دور شاہجہانی میں متعدد علماء و مشائخ اور فقہائے عظام ہندوستان میں رونق افروز تھے۔ عہد شاہجہان کے مشہور مدارس میں بڑے بڑے نامور علماء طلباء کو دینی تعلیم دیتے تھے۔ ان علماء میں چند علماء کے نام یہ ہیں: علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی، شیخ جان اللہ، شیخ عبد الکریم چشتی لاہوری، شیخ جان محمد لاہوری، محمد صدیق لاہوری، امام گاموں، مولانا محمد فاضل بدخشی، ملا عبد السلام، مولانا عبد الطیف سلطان پوری، ملا یعقوب لاہوری، نواب سعد اللہ خان، حاجی محمد سعید اور ملا عصمت اللہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شاہجہان کے وزرا میں بھی جید علماء شامل تھے جن میں ایک علامی محمد افضل تھے جو معقولات و منقولات کے جید عالم تھے۔ معاملات سلطنت میں بھی ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ شاہجہان ان پر بہت اعتماد کرتا تھا اور وہ فطانت و فراست میں یگانۂ روزگار تھے۔ ان کے بعد سعد اللہ خان چنیوٹی کو اس اعلیٰ منصب پر فائز کیا گیا۔ برصغیر پاک وہند کے وسیع العلم بزرگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ یہ معقولات و منقولات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ برصغیر پاک وہند کے اس جید عالم نے اپنے علوم و معارف کی روشنی سے طلباء کے ذہنوں کو منور کیا۔ یہ پاک وہند کے آسمان علم و فضل کے درخشاں ستارے تھے۔ انہوں نے عہد شاہجہانی میں شہرت و ناموری کی منزلیں طے کیں۔ ان کی تصنیفات کو عالم اسلام میں بہت قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ پورے چار سو سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ان کی عظمت و فضیلت کا علم دنیا میں لہرا رہا ہے۔

شاہجہاں کے بعد اس کا بیٹا اورنگ زیب عالمگیر یکم ذی قعدہ 1068ھ / 23 جولائی 1658ء کو باغ اغر آباد (دہلی) میں جو بعد میں شالامار باغ کہلایا، جمعہ کے دن تخت ہند پر متمکن ہوا۔ اس وقت اس کی عمر چالیس برس تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کا دور حکمرانی بہت طویل ہے۔ اس نے قمری حساب سے برصغیر پاک وہند پر پچاس سال، دو ماہ اور ستائیس دن حکومت کی۔ [62] یہ بادشاہ نہایت عاقل و فہیم، مردم شناس، کشور کشا، جرأت مند اور زبردست منتظم تھا۔ بڑے

ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک، انتہائی بردبار اور حلیم الطبع تھا۔ قرآن کی تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم مروجہ کا عالم تھا اور اپنے دور کے علماء و فقہاء اور مشائخ و صوفیاء کا بے حد احترام کرتا تھا۔ متبع سنت اور حامیٔ دین متین تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر خود بہت بڑا عالم اور خطاط تھا۔ علماء کی قدر کرتا تھا۔ یہ بادشاہ بہت علم دوست تھا۔ عالمگیر کی تالیف "فتاویٰ عالمگیری" اس کی علم دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اس کی دینی زندگی کی عکاسی کرنے والی کتاب ہے۔ بادشاہ نے اشاعت تعلیم میں اپنی تمام زندگی صرف کی۔ اس نے مدارس بنوائے اور علماء کو مدد معاش دی تاکہ وہ اپنے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا کر سکیں۔ اورنگ زیب عالمگیر نے سرکاری خزانے پر یہ بوجھ ڈالا کہ ملک کے ہر طالب علم کو یومیہ دیا جائے اور تمام ملک کے ہر حصے میں تعلیم پانے والوں کے نام اس علاقے کے سرکاری رجسٹروں میں درج کیے جائیں چنانچہ ابتدائی درجے کے ہر طالب علم کو ایک آنہ، دوسرے درجے کے طالب علم کو دو آنے اور آخری درجے میں پڑھنے والے کو آٹھ آنے ملا کرتے تھے۔ اسی لیے ممالک محروسہ کے تمام صوبوں میں یہ مقدس فرمان جاری ہو چکا تھا کہ ہر صوبہ میں مدرس مقرر کیے جائیں۔ طلباء کو میزان سے لے کر کشاف تک تعلیم دی جائے اور ان کو صدر صوبہ کے باہمی مشورے سے اور مدرسوں کی تصدیق سے اس صوبے کے خزانچی کی تحویل سے مدد معاش دی جائے۔ اس لیے اس وقت احمد آباد، پٹن اور سورت میں تین مدارس اور احمد آباد میں پینتالیس طلباء کا اضافہ کیا گیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کو مسلم دینی تعلیم اور فقہ اسلامی میں بہت گہری دلچسپی تھی۔ اسی لیے اس کے حکم سے اس کے شاہی کتب خانے میں دینیات، فقہ اسلامی اور دوسرے علوم پر بہت سی اہم کتابیں جمع کی گئیں۔ "فتاویٰ عالمگیری" جسے "فتاویٰ ہندیہ" کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، اسی کے حکم اور سعی و کوشش سے معرض تصنیف میں لائی گئی اور پھر اسی کے نام سے منسوب ہوئی۔ یہ بھی شاہی کتب خانے میں موجود تھی۔ جیسا کہ محمد ساقی مستعد خان لکھتے ہیں:

> "مشہور" فتاویٰ عالمگیری" جو فقہ اسلامی پر ایک بڑی مستند کتاب ہے اور آج مسلمانوں کے مقدمات کے فیصلہ کے لیے اس کا وجود ناگزیر ہے، اس شاہی کتب خانے میں موجود ہے۔"[63]

فتاویٰ عالمگیری فقہ حنفی پر مشتمل ہے اور اس مسلک کی ایک ضخیم اور مفصل کتاب ہے۔ فقہی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں بیان کردہ مسائل فقہ حنفی کی رو سے راجح ہیں یا ظاہر الروایت کے ہیں۔[64] فتاویٰ عالمگیری کی فقہی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ فقہ کی تمام اہم اور قابل ذکر کتابوں کا نچوڑ ہے اور اس کے مآخذ و مراجع فقہ حنفیہ میں بڑی وقعت رکھتے ہیں۔ اورنگ زیب نے بے شمار دارالعلوم اور ان گنت مدارس قائم کیے۔ جیسا کہ مسٹر کین نے اورنگ زیب عالمگیر کے دور کے تعمیر کردہ مدارس اور دارالعلوم کے بارے میں لکھا ہے:

> "اورنگ زیب نے بے شمار دارالعلوم اور مدارس قائم کیے تھے۔"[65]

برصغیر پاک و ہند میں اکبری دور میں شروع ہونے والا تیسرا تعلیمی دور اورنگ زیب عالمگیر کے دور حکومت کے ابتدائی سالوں 1068ھ/1658ء تک جاری رہا جس میں منطق اور فلسفہ کا بہت چرچا رہا۔ مگر اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں جو تعلیمی انقلاب آیا وہ اسلامی مدارس میں درس نظامی کے نام سے ایک نئے نصاب تعلیم کا لاگو ہونا تھا۔ اس نئے نصاب کے رائج ہونے کے بعد برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں چوتھے تعلیمی دور کا آغاز ہو گیا۔

درس نظامی کے نصابات کو وضع کرنے والے مولانا نظام الدین انصاری سہالوی 1161ھ/1748ء لکھنو کے نواح میں واقع موضع سہالی (حال واقع بنگلہ دیش) کے رہنے والے تھے اور ہندوستان کے اس وقت کے معروف عالم مولانا قطب الدین عبد العلیم انصاری سہالوی کے فرزند ارجمند تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے ان کے خاندان کو فرنگی محل لکھنو میں ایک عالی شان محل عطا کیا تو اس طرح آپ لکھنو میں منتقل ہو گئے۔ آپ نے لکھنو میں مستقل سکونت اختیار کی اور اپنے والد کی مسند درس و تدریس کو سنبھالا۔ درس نظامی کے نصابات وضع کر کے رائج کیے اور ہندوستانی علماء میں نمایاں مقام کے حامل ہو گئے۔ یہ نصاب انہی کے نام کی مناسبت سے "درس نظامی" کے نام سے مخصوص ہوا۔ یہ نیا نصاب منظر عام پر آنے کے بعد بہت جلد برصغیر کے اسلامی مدارس میں اس نصاب کو قبول کر لیا گیا۔ اس نصاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی یہ نصاب تعلیم معمولی رد و بدل کے بعد آج تک برصغیر پاک و ہند کے جملہ اسلامی مدارس میں رائج ہے۔ درس نظامی کے نصابات کے مختلف شعبوں میں درج ذیل نصابی کتب شامل تھیں:

- علم صرف: میزان، منشعب، پنج گنج، زبدہ، صرف میر، فصول اکبری اور شافیہ۔
- علم نحو: نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح کافیہ از ملا جامی تا بحث حال۔
- علم بلاغت: مختصر المعانی، مطول تا بحث ما انا قلت۔
- علم منطق: صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی تصدیقات مع میر، سلم العلوم، میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال۔
- فلسفہ و حکمت: شرح ہدایۃ الحکمۃ از میبدی، شرح ہدایۃ الحکمت از ملا صدر شیرازی تا بحث مکان، الشمس لبازغۃ از ملا جون پوری۔
- ریاضی: خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس کا مقالہ اولیٰ، تشریح الافلاک، رسالہ قوشجیہ، شرح چغمینی کا پہلا باب۔
- اصول فقہ: نور الانوار، توضیح التلویح تا مقدمات اربع، مسلم الثبوت تا مبادی کلامیہ۔
- فقہ: شرح وقایہ کا نصف اول اور ہدایہ کا نصف ثانی۔
- علم کلام: شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی کا پہلا حصہ، میر زاہد، شرح مواقف (بحث امور عامہ)۔

- علم تفسیر: جلالین، بیضاوی تا آخر سورۃ بقرہ۔
- علم حدیث: مشکوۃ المصابیح تا کتاب الجمعہ۔
- علم مناظرہ: رسالہ رشیدیہ۔[66]

ملا سہالوی نے اپنے تجویز کردہ نصاب کو ابتدائی طور پر مدرسہ عالیہ نظامیہ لکھنو میں نافذ کیا۔ مدرسہ عالیہ نظامیہ لکھنو کو برصغیر کی عظیم اور قدیم درسگاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مدرسے کی عظمت کی بڑی وجہ اس کا نصاب ہے جو ملا نظام الدین نے خود مرتب و مدون کیا ہے۔ یہ نصاب علماء وقت نے جلد قبول کر لیا اور برصغیر پاک و ہند کے تعلیمی اداروں اور درسگاہوں میں رائج ہوا۔ یہ نصاب اتنا مقبول ہوا کہ اس کے اثرات آج بھی باقی ہیں۔ یہی نصاب برصغیر پاک وہند کی قریباً ہر اسلامی درسگاہ میں رائج ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گذشتہ دو صدیوں میں علماء کرام نے اپنی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے اس سلسلہ نصابات میں کئی تبدیلیاں کیں۔ غالباً سب سے پہلے تبدیلی لانے کا خیال مدرسہ عالیہ نظامیہ فرنگی محل لکھنو کے شیخ مولانا محمد قطب الدین ہوا۔ چنانچہ انہوں نے بعض کتب اور مضامین میں رد و بدل کیا۔ اس کے بعد مولانا عبدالحق محدث دہلوی اور مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی نے تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ اسی طرح علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابو المحاسن سجادیہ، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اور متعدد علماء کرام نے ان نصابات کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔[67] چنانچہ یہی درس نظامی کے نصابات اب معمولی رد و بدل کے ساتھ دارالعلوم دیوبند اور بلا تخصیص مسالک پاکستان و ہند کے جملہ مدارس عربیہ اسلامیہ میں تاحال جاری ہیں۔ البتہ مختلف مسالک کے مدارس میں فقہ و عقائد اور تفسیر و حدیث کی کتب ان کے اپنے اپنے مسالک کے مطابق پڑھائی جاتی ہیں۔

خلاصہ بحث

درج بالا بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر میں برطانوی سامراج کے پہلے مسلم دور حکومت میں علمی، ادبی اور دینی تعلیم کے رجحانات غالب رہے۔ مسلم علماء کرام نے اپنی تمام تر توجہ تفسیر، حدیث، فقہ اور عقلی علوم و فنون کی تعلیم پر مرکوز رکھی۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم دین اسلام کی روحانی و اخلاقی تعلیمات پر مبنی تھا۔ تمام مسلم حکمرانوں نے علوم و فنون کی ترقی میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ وہ علماء کے قدردان تھے اور ان کے دربار علماء و فضلاء سے پُر رہتے تھے۔ ان کے عہد میں طلباء کو مفت تعلیم فراہم کی جاتی تھی اور ان کی مالی اعانت کا بھی انتظام تھا۔ تعلیمی ادارے بنیادی طور پر مذہبی نوعیت کے حامل تھے۔ مساجد میں باجماعت نماز کی ادائیگی کے ساتھ طلباء کے درس قرآن کا بھی انتظام تھا۔ مساجد سے ملحق مدارس قائم کیے جاتے تھے۔ ان کی آمدنی اور طلباء کے وظائف کے لیے بڑے بڑے دیہات وقف تھے۔ ہر بڑا شہر علم کا گہوارہ تھا۔ ہندوستان میں مغلیہ دور حکومت میں علم و فن، خطاطی، مصوری، موسیقی، فن تعمیر، شعر

و ادب نیز مذہبی اور دینی ادب اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ اس دور میں بہترین صاحب علم و فن، سپہ سالار، مدبر و منتظم، ماہر تعمیرات و سرپرست علم و فن بادشاہ ہوئے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہو گیا تھا اور اشاعت تعلیم کے لیے حکومت کی سرپرستی میں کمی واقع ہو گئی تھی، اس کے باوجود اس دور میں بھی بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے۔ یعنی اوسطاً ہر چالیس ہزار افراد کے لیے ایک مدرسہ موجود تھا۔ مسلم حکمرانوں کی علم کی سرپرستی کا اثر عام افراد نے بھی قبول کیا اور انہوں نے ذاتی طور پر مدرسے قائم کیے جن میں "مدرسہ غازی الدین" بھی شامل ہے۔ یہ مدرسہ غازی الدین نامی ایک شخص نے اپنی زندگی میں دہلی میں اجمیری گیٹ کے قریب تعمیر کیا۔ اس مدرسہ کے ساتھ ایک مسجد، مقبرہ اور ان سب کے انچارج کی رہائش گاہ بھی تھی۔ عالمگیر کے دور میں بھی اکرم الدین نامی ایک شخص نے احمد آباد میں 1697ء میں ایک سو چوبیس ہزار روپے کی لاگت سے ایک مدرسہ قائم کیا جس کو چلانے کے لیے اسے شہنشاہ کی طرف سے دو گاؤں دیئے گئے۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی آمد کے بعد تعلیم کا حصول ہر مسلمان، امیر، غریب، بچے، بوڑھے، مرد و خواتین کے لیے آسان ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے لوگوں کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام تھا۔ اور دینی تعلیم کے ساتھ ان قائم کردہ مدارس میں زراعت اور اکاؤنٹس کی خصوصی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ دنیاوی علوم کی تعلیم میں قانون، طبیعات، فلسفہ، زراعت، معاشیات اور تاریخ کے مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔

حوالہ جات وحواشی

1. Oxford Advanced Learner's Dictionary, 8th ed., S.V. "Education".

2۔ مقبول احمد، علمی اساسیات علم التعلیم، علمی کتاب خانہ، لاہور، 2015، ص:8-5

3۔ سورۃ العلق:96/1-5

4۔ سورۃ الزمر:9/39

5۔ ابن ماجہ، السنن، کتاب السنۃ۔ باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س ن ص:34

6۔ محمد اقبال، قاری، پروفیسر، مقالات اسلامیہ، انجمن نوجوانان اسلام، رجسٹرڈ، فیصل آباد، 2005، ص:140

7۔ عبدالرشید ارشد، پاکستان میں تعلیم کا ارتقاء، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، 1995، ص:16

8. Kale, V.G. Indian Administration. PP. 188-89; Law, N.N. Promotion of Learning in Muslim India. London: Oxford Press (1916) PP. 161-162; Dr J.H. Cousin's Articles in The Eastern Times dated 7th June, 1935.
9. Imperial Gazetteer of India, 4/436
10. Law, N.N. Promotion of Learning in Muslim India. London: Oxford Press (1916) PP. 104-105.
11. Swami Abhedananda. India and Her People. P. 188.
12. Sir Abdul Qadir's Lecture on "The Cultural Influences of Islam in India", Published in J.R.S.A. (January 10, 1936); Imperial Gazetteer of India, Vol IV. P 408; Yusuf Ali. Making of India. P 87.
13. Zia, Dr. "Systems of Examinations" Muslim University Journal, Vol. I. P 304; Law, N.N. Promotion of Learning in Muslim India. London: Oxford Press (1916) PP. 99.

14۔ زبید احمد، ڈاکٹر، عربی ادبیات میں برعظیم پاک وہند کا حصہ، ترجمہ شاہد حسین رزاقی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1973، ص:198

15۔ بختیار حسین صدیقی، برصغیر پاک وہند کے قدیم عربی مدارس کا نظام تعلیم، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1982، ص:9

16۔ محمد اسحاق بٹھی، فقہائے ھند 1، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1974، 1/2

17۔ امیر الہدیٰ، مسلمانوں کے علمی اور ثقافتی کارنامے، قمر کتاب گھر، کراچی، 1973، 1/322

18۔ بختیار حسین صدیقی، برصغیر پاک وہند کے قدیم عربی مدارس کا نظام تعلیم، ص:7

19۔ سعید احمد رفیق، پروفیسر، مسلمانوں کا نظام تعلیم، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، 1962، ص:72

20۔ سید عبدالحئی بریلوی، نزہۃ الخواطر ج، ترجمہ ابو یحییٰ امام خان نوشہروی، س ن، 1985، 1/149

21۔ فلپ حتی، دی ہسٹری آف دی عزیز، میکملن اینڈ کمپنی، لندن، 1953، ص:41

22۔ امیر خورد، سیر الاولیاء، مطبع محب ہند، دہلی، 1302ھ، ص:60

23. Sir, Wolseley Haig. The Cambridge History of India. (Delhi: 1958). 3/49 -48
24. Hamiuddin Khan, Prof. History of Muslim Education. Vol.I. Karachi: Academy of Educational Research All Pakistan Educational Conference (1967). PP. 43-46.

25۔ حسن نظامی، تاج المآثر، روٹو گراف مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور، س ن، ص:82

26۔ محمد عوفی، لب الالباب، کتاب خانہ خاج علی علمی، تہران، 1335ش، ص:543

27۔ قاضی جاوید "ہندی مسلم تہذیب"، تخلیقات، لاہور، 1995، ص:39

28۔ ابو الحسنات ندوی، مولانا ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، الیکٹرک پریس، امرتسر، 1992، ص:21

29۔ فرشتہ، محمد قاسم، تاریخ فرشتہ، ترجمہ عبد الحئ خواجہ، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن، 1/259

30۔ فرشتہ، محمد قاسم، تاریخ فرشتہ، ترجمہ عبد الحئ خواجہ، ص:290

31۔ ابو الحسنات ندوی، ختیار حسین صدیقی، برصغیر پاک وہند کے قدیم عربی مدارس کا نظام تعلیم، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1982، ص:11, 12

32۔ شوکت علی فہمی، ہندوستان میں اسلامی حکومت، جہان علم وادب، لاہور، س ن، ص:162-160

33۔ محمد اسحٰق بھٹی، فقہائے ہند، دارالنوادر۔ لاہور، س ن، ص:42

34۔ عبد الحئ حسنی، مولانا، "ہند اور پاکستان کا قدیم درس نظامی"، ماہنامہ ثقافت، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، اگست 1967، ص:20

35۔ محمد اسحٰق بھٹی، برصغیر میں علم فقہ، کتاب سرائے بیت الحکمت لاہور، 2009ء، ص:118

36۔ این۔ این۔ لاء، ڈاکٹر، عہد اسلامی میں علمی ترقی، اکیڈمی آف ایجوکیشن ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس، کراچی، 1974ء، ص:85

37۔ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، ترجمہ سید معین الحق، س ن، 1969

38۔ بختیار حسین صدیقی، برصغیر پاک وہند کے قدیم عربی مدارس کا نظام تعلیم، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1982ء، ص:14-13

39۔ عبد القادر بدایونی، منتخب التواریخ، ترجمہ عبد الحئ علوی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن، ص:213

40. Law, N.N, Promotion of Learning in Muslim India, Oxford Press, London, 1916, P. 121.

41. Jaffar, S. M, Mughal Empire, Maktaba Aalia, Lahore, 1988, P. 73.

42۔ ابو الحسنات ندوی، مولانا، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، الیکٹرک پریس، امرتسر، 1992ء، ص:29

43۔ محمد اسحٰق بھٹی، فقہائے ہند، دارالنوادر، لاہور، س ن، ص:33

44۔ صفدر حیات صفدر و غلام جیلانی مخدوم، اسلامی ہند کے مسلم حکمرانوں کے تہذیبی اور سیاسی کارنامے، نیو بک پیلس، لاہور، 1989ء، ص:55

45۔ ابو الفضل، آئین اکبری، ترجمہ مولوی فدا علی، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 1975ء، ص:278

46۔ ابو الفضل۔ آئین اکبری، ترجمہ مولوی فدا علی، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، س ن، ص:418-417

47۔ ایس۔ ایم۔ جعفر، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، مکتبہ عالیہ، لاہور، 1987ء، ص:65

48۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یو۔ پی)، 2009ء، ص:36

49۔ جہانگیر، نور الدین، تزک جہانگیری، ترجمہ مولوی احمد علی رام پوری، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2004ء، ص:347-346

50۔ عبد الحئ حسنی لکھنوی، نزہۃ الخواطر، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد دکن، 1955، ص:168

51۔ جہانگیر، نور الدین، تزک جہانگیری، مطبع نامی منشی نول کشور، لکھنو، 1914ء، ص:10

52۔ ابو الحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، 2014ء، ص:32

53. Law, N.N, Promotion of Learning in Muslim India, Oxford Press, London, 1916

54۔ فقیر محمد جہلمی، حدائق الحنفیہ، مطبع نول کشور، لکھنو، 1906ء، ص:409

55۔ لالہ سبحان رائے بٹالوی، خلاصۃ التواریخ، مطبع جی اینڈ سنز، دہلی، 1918ء، ص:73

56۔ شبلی نعمانی، مولانا، شعر العجم، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1992ء، 1/165

57۔ داراشکوہ، سفینۃ الاولیاء، س ن، 1876ء، ص:165

58۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص:39

59. Law, N.N, Promotion of Learning in Muslim India, Oxford Press, London, 1916, P. 181.

60۔ سالک، "لاہور کے علمائے کرام، دینی مدرسے"، نقوش، لاہور، س ن، ص:492

61۔ آزاد بلگرامی، مولانا، مآثر الاکرام، مکتب احیاء العلوم الشرقیہ، لاہور، 1971ء، ص:221

62۔ محمد اسحاق بھٹی، فقہائے ہند، کتاب سرائے، لاہور، 2013، 5/535

63۔ محمد ساقی مستعد خان، مآثر عالمگیری، ص:53

64۔ محمد اسحاق بھٹی۔ برصغیر میں علم فقہ، کتاب سرائے بیت الحکمت، لاہور، 2009ء، ص:276-275

65. Jaffar, S. M, Mughal Empire, Maktaba Aalia, Lahore, 1988, P. 23.

66۔ بختیار حسین صدیقی، برصغیر پاک وہند کے قدیم عربی مدارس کا نظام تعلیم، ص:22

67۔ نذر محمد، حافظ، جائزہ مدارس عربیہ اسلامیہ مغربی پاکستان، جامعہ چشتیہ ٹرسٹ، لائلپور، 1960، ص:767